اقامت دین

فرض ہے

مولانا سید احمد عروج قادریؒ

اقامتِ دین فرض ہے

مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ



مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔۲۵

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

''فریضۂ اقامت دین'' پر ایک ایسے مختصر کتابچے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے جس کو کم وقت میں پڑھا جا سکے اور جس میں لوگوں کے اعتراضات اور ان کے جوابات سے قطع نظر کر کے مثبت طریقے پر قرآن وسنت کے دلائل دیے گئے ہوں۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ کتابچہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کتابچے میں قرآن وسنت کے دلائل سے واضح کیا گیا ہے کہ اقامتِ دین کو فرض، ہم اپنے جی سے نہیں کہتے بلکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو اللہ نے تمام مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ یہی ان کا نصب العین اور مقصد وجود ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس فریضے کو ادا کر کے ہی ہم اپنے رب کی خوش نودی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفتوں اور مشکلات کے ہجوم میں بھی ہم اپنے اس نصب العین کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اگر اللہ ہم سے خوش ہو اور تمام دنیا ناراض ہو تو ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ ایک بار حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ مجھے کوئی مختصر نصیحت لکھ بھیجیے۔ انھوں نے ان کو نبی ﷺ کی یہ حدیث لکھ بھیجی:

عن عبادة بن الصامت قال بايعنا رسول الله ﷺ على السمع والطاعة فى المنشط والمكره و ان لاّ ننازع الامر اهله و ان نقوم او نقول بالحق حيثما كنا لا نخاف فى الله لومة لائم.

(بخاری، کتاب الاَحکام، باب کیف یبایع الِامام الناس)

''حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے پسندیدہ و ناپسندیدہ دونوں حالات میں سمع وطاعت پر بیعت کی اور اس بات پر بیعت کی کہ

ہم ہر معاملے میں حق بات کہیں، جہاں بھی رہیں اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔"

ارشادِ نبوی کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کو خوش رکھو، خواہ اس کی وجہ سے تمام دنیا تم سے ناراض ہو جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتابچے کو قبول فرمائے، مسلمانوں کے دلوں کو کھول دے اور اپنے اس حقیر بندے کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین!

سیّد احمد قادری
دفتر ماہ نامہ 'زندگی' رام پور، (یوپی)

اقامتِ دین کا مطلب

اقامتِ دین کے فرض وواجب ہونے کی دلیلیں پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا مطلب اور مفہوم واضح کر دیا جائے۔

"اقامت دین" میں دین سے مراد وہ دین حق ہے، جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے نازل فرمایا اور جواب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے، جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔

اِس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرح سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

دستور جماعت اسلامی ہند کی اس عبارت میں دین اور اقامت دین کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دین اسلام کو اس کے تمام احکام و قوانین اور اس کی تمام تعلیمات و ہدایات کے ساتھ پوری انسانی زندگی کا دین بنایا جائے۔ زندگی کو چند شعبوں اور چند خانوں میں تقسیم کر کے بعض

میں اسلام کی پیروی کرنا اور بعض میں غیر اسلام کی پیروی کرنا قطعاً غلط ہے، جس طرح مسجد میں اسلام کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح بازار میں، اسمبلی میں اور پارلیمنٹ میں بھی اس کے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پارلیمنٹ میں بیٹھ کر اسلام کے خلاف قانون بنانا یا اپنے جی سے گھڑے ہوئے احکام صادر کرنا، اللہ سے بغاوت کرنا ہے، جو اس پوری کائنات کا تنہا بادشاہ اور برحق حکمراں ہے اور جب تک یہ بغاوت ختم اور اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو اقامت دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

اقامت دین کا مثالی نمونہ

اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین نمونہ وہ ہے، جسے حضرت محمد ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قایم فرمایا۔

اس مثالی نمونے کے لیے خلافت راشدہ خلافت علی منہاج النبوہ (نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق خلافت)، حکومت الٰہیہ اور اسلامی حکومت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین نے جو حکومت قائم کی تھی اس میں بغیر کسی تفریق و تقسیم کے پورے دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کی جاتی تھی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کر دیا گیا تھا کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل ٹھیک ٹھیک اسی دین کے مطابق تھی۔ اس مملکت میں جا کر ہر شخص اپنی کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ اسلامی حکومت اور قرآنی معاشرہ کیسا ہوتا ہے اور ''اقامت دین'' کا مفہوم کیا ہے، جس طرح ایک کھڑے ہوئے شخص کے قد و قامت، جسمانی ساخت، رنگ و روپ اور چہرے مہرے کو پہچاننے کے لیے دو آنکھیں کافی ہیں، اسی طرح اقامت دین کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے عہد رسالت و عہد خلافت راشدہ کا مثالی نمونہ کافی ہے، جس کی بلند قامتی اور اس کے تمام رنگ و روپ تاریخ کے صفحات نے محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ مثالی نمونہ صرف نمونہ ہی نہیں ہے بلکہ فریضۂ اقامت دین کی ایک روشن دلیل بھی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا نتیجہ

سینکڑوں سال سے مسلمان جس زوال و انحطاط کا شکار ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمان بھی عام طور سے دین اسلام کو اسی طرح کا ایک مذہب سمجھتے ہیں، جس طرح کے اور دوسرے مذاہب پائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے مذہب کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، وراثت

اور اسی طرح کے چند مسئلوں تک محدود کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک وعظ و نصیحت کی مجلسوں، میلاد کی محفلوں اور کلمہ و نماز کی تعلیم سے دین و ایمان کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، باقی رہی سیاست و حکومت تو انھوں نے اسے دنیاداری کے خانے میں ڈال کر اسے دنیادار لوگوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس میں قصور مسلمان عوام کا نہیں بلکہ ان خاص لوگوں کا ہے، جنھوں نے ان کے دماغوں میں دین اسلام کا یہ محدود مفہوم اتارا اور جمایا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب جماعت اسلامی اور اس طرح کی دوسری جماعتوں کی سعی و کوشش سے نہ صرف ہندستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی دین اسلام کے بارے میں یہ بے بنیاد خیال ختم ہوتا جا رہا ہے اور مسلمان اسے پوری زندگی کا مکمل نظام اور قانون سمجھنے لگے ہیں۔ انھیں قرآن مجید کی آیات اور رسول مقبول ﷺ کی احادیث کی دلیلوں سے بتایا جا رہا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد اور ان کا نصب العین کیا ہے اور کس چیز کو ان کی تمام کوششوں اور جدوجہد کا مرکز ہونا چاہیے۔

قرآن مجید کے دلائل

''اقامت دین'' مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے فرض و واجب ہونے کے دلائل سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ ہم اس کی دلیلیں اختصار کے ساتھ ذیل کے چند نکات کے تحت پیش کریں گے۔

۱- حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور انھیں دنیا میں بھیجنے کا مقصد۔
۲- سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کی نبوت و رسالت کا مقصد۔
۳- قرآن اور اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں نازل کرنے کا مقصد۔
۴- اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے خلاف حکم چلانے اور فیصلہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔
۵- چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو کوڑے لگانے کا حکم۔
۶- اقامتِ دین کے لفظ کے ساتھ قرآن کا صریح حکم۔
۷- دین اسلام کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنے والوں سے مدد کا وعدہ۔
۸- غلبہ دین کی جدوجہد میں مال خرچ نہ کرنے والوں اور جان چرانے والوں کا حکم۔
۹- انسان اور جنات کو پیدا کرنے کی غرض۔
۱۰- اُمت مسلمہ کا نصب العین اور اس کا مقصد حیات۔

ان دس نکات میں سے ہر نکتہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین اسلام کو غالب کرنا، اس کو قائم کرنا اور قرآن مجید کے تمام قوانین کو نافذ کرنا مسلمانوں کی ذمے داری اور ان کی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے۔

پہلی دلیل

ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا؟ ان کی حیثیت کیا تھی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں کس لیے بھیجا تھا؟ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں سب سے پہلے انسان ہی نہیں بلکہ اللہ کے سب سے پہلے پیغمبر بھی تھے، اس لیے انھیں دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد ہوگا اس کے اہم ترین فریضہ حیات ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا مقصد کیا تھا، ان کی حیثیت کیا تھی اور انھیں کس ہدایت کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا تھا اس کا مفصل بیان سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ سے آیت ۳۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ آیتیں واضح الفاظ میں یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی خلافت و نیابت کے عظیم ترین کام کی انجام دہی کے لیے دنیا میں بھیجا تھا اور یہی ان کی تخلیق کا مقصد تھا۔ اس دنیا میں ان کی حیثیت اللہ کے خلیفہ اور نائب کی تھی۔ آیت خلافت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا صدرالدین اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:

''خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ ذاتی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کیے ہوئے اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کی منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ یہ منصب خلافت اس کے تاج عظمت کا وہ درخشاں گوہر ہے جو کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اس بے نظیر نعمت کا ذکر بھی ایک خاص اہتمام سے فرمایا۔ پھر اس کی جناب سے ملائکہ کے سامنے تخلیق آدم سے پہلے ہی اس کے ارادے کا ذکر اور وہ بھی اسی منصب خلافت ہی کا نام لے کر، اس کی غیر معمولی اہمیت کا حامل

ہے۔ شاید انسان کے اس نوعی شرف کا اس سے اونچا تخیل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب انسان کی جس طرح یہ خود ناشناسی اور اپنی تحقیر ہے کہ وہ ان مخلوقات کے آگے سرنیاز خم کردے، جن پر اس کو نیابتی آقائی اور حکمرانی کا مقام بخشا گیا ہے۔ اسی طرح اس کی یہ خود فریبی، خیانت اور غداری ہوگی کہ وہ اپنے اصل مالک کی مرضیات سے بے نیاز ہو کر من مانے طریقے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی اصل حقیقت ٹھیک ٹھیک بیان کردی گئی ہے اور نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کردیا گیا ہے، جس کے معلوم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور فلاح بخش ہیں جنھیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس سے ربط دے کر اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''(۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں:

''اور خلیفۃ اللہ وہ ہے، جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے۔''(۲)

ہمارے اگلے مفسرین نے اس کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، ہم یہاں صرف اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ امام بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:

''اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کی زمین پر اس کے احکام کی اقامت کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔''

تفسیر خازن میں اس کی تائید ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''اور صحیح قول یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ وہ اللہ کی زمین میں اس کی حدود کی اقامت کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔''

''خلیفہ'' کی تفسیر جلالین میں یہ ہے:

''وہ زمین پر میرے احکام کو نافذ کرنے میں میری نیابت کرے گا اور وہ خلیفہ آدم ہیں۔''

تفسیر بیضاوی میں اس طرح ہے:

''اور خلیفہ اس کو کہتے ہیں، جو دوسرے کا قائم مقام اور اس کا نائب ہو اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اس لیے کہ وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح ہر نبی اللہ کے خلیفہ تھے۔ اللہ نے تمام انبیاء کو زمین کی آبادی، لوگوں کے امور کی تدبیر، ان کے نفوس کی تکمیل اور ان پر احکامِ الٰہی کی تنفیذ کے لیے اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اللہ کسی نائب

(۱) تیسیر القرآن، حاشیہ ۴۱، ص ۷۱، ۷۲

(۲) مولانا عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، ج ۱ ص ۹۵، ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ

کا محتاج ہے بلکہ اس لیے کہ جن لوگوں پر اس نے اپنا نائب مقرر کیا وہ بلا واسطہ اس کے اوامر اور اس کے فیض کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔''

اسی طرح کی عبارت روح المعانی میں بھی ہے، جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

''آدم زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح تمام انبیاء اللہ کے خلیفہ تھے۔''

مفسرین کرام کی ان عبارتوں سے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو جو خلافت ارضی عطا کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا:

''زمین کی آبادی، لوگوں کے لیے سیاست کی انجام دہی (یعنی ان کے تمام امور و معاملات کا انتظام اور تدبیر)، ان کے نفوس کی تکمیل، اللہ کے شرعی فیصلوں کی تنفیذ اور حدودِ الٰہی کی اقامت۔''

ہم نے اوپر دستور جماعت اسلامی ہند کے حوالے سے ''اقامت دین'' کا جو مطلب و مفہوم واضح کیا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے؟ مفسرین کرام نے ان چار نکات میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے انسانی زندگی کا کون سا شعبہ خارج ہے؟ مسلمانوں پر اقامت دین کے فرض و واجب ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی؟ جو کام انسان کی غایت تخلیق اور اس کا مقصد وجود ہو وہ بھی اس پر فرض نہ ہوگا تو آخر کون سا کام اس پر فرض ہوگا؟

سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط خلیفہ کے علاوہ ''خلیفہ'' کا لفظ ایک جگہ اور قرآن میں آیا ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (ص:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے زمین میں تمھیں اپنا نائب بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں میں حق و انصاف کے ساتھ حکومت کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔''

اس آیت میں اللہ نے صراحت کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو اپنا خلیفہ اور نائب کہا ہے اور اس کا مقصد بھی یہی بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کے اُتارے ہوئے قانون عدل کے مطابق حکومت کریں اور مقدمات کا فیصلہ سنائیں۔ اگرچہ منشائے تخلیق کے لحاظ سے تو ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ لیکن اس عظیم منصب کی عین فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ منصب، صفات کے ساتھ مشروط ہو، غیر مشروط نہ ہو۔ اس کے اہل اور جائز حق دار وہی لوگ ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں اور جو لوگ اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔ جب مومنینِ صالحین ہی خلافت الٰہی کے مستحق ہیں تو ان کے منصب کا یہ عین تقاضا ہے کہ وہ دوسرے گرے ہوئے انسانوں کو

بغاوت کی پستی سے اُٹھا کر انھیں خلافت الٰہی کی بلندی تک پہنچانے کی سعی کریں۔ اوپر کی تفصیل سے یہ بات خود ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو جو خدمت سپرد کی ہے وہ ایک ایسے نظام کی متقاضی ہے، جس کی بنیاد نیابت الٰہی کے نظریے پر رکھی گئی ہو۔ کیوں کہ اس کے بغیر یہ خدمت پوری طرح انجام نہیں دی جاسکتی۔

دوسری دلیل

سیدنا محمد ﷺ کی بعثت بھی اسی لیے ہوئی تھی کہ وہ دین حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کردیں۔ اس کی صراحت سورۂ توبہ آیت ۳۳، سورۂ صف آیت ۹، اور سورۂ فتح آیت ۲۸ میں ہے۔ میں یہاں سورۂ فتح کی آیت نقل کرتا ہوں:

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ○ (الفتح:۲۸)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے اور (اس حقیقت پر) اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف کی آیتوں کا آخری ٹکڑا وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ہے اور سورۃ الفتح کی آیت کا آخری ٹکڑا وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دین حق کا غلبہ مشرکوں اور کافروں کو خواہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو ہم نے اپنے رسول کو اسی مقصد سے بھیجا ہے اور سورۃ الفتح کا آخری ٹکڑا یہ بتاتا ہے کہ بعثتِ محمدی کی اس غرض و غایت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اب اگر تمام دنیا مل کر بھی یہ کہے کہ محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ نہیں تھا تو اس کی بات قابل سماعت نہ ہوگی۔

سورۃ التوبہ آیت ۳۳ کے تحت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

''دین کا لفظ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، عربی زبان میں اس نظام زندگی یا طریق زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ پس بعثت رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دین حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کردے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظام زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب ہوکر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے بلکہ وہ بادشاہ ارض و سما کا

نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد ۲، حاشیہ ۳۲، ص ۱۹۰)

حضورؐ کے اس مقصد بعثت کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''ازالۃ الخفاء'' میں بار بار متعدد مقامات پر لکھا ہے۔ اس آیت کا حوالہ دیے بغیر بھی لکھا ہے اور یہ آیت پیش کر کے بھی لکھا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اللہ کی یہ سنت پیش کی ہے کہ کس طرح وہ باغی اور سرکش قوموں کو مغلوب اور تباہ کرتا رہتا ہے۔ اسی سلسلۂ بیان میں انھوں نے حضورؐ کے مقصدِ بعثت اور ادیانِ باطلہ کی مغلوبیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''و آں وضع خاص ظہور دین ایشان است بر ادیان ہمہ آں در ضمن کتب حامیان ادیان و داعیان آنہا بقتل و سبی و نہب و اخذ خراج و جزیہ و ازالہ دولت و شوکت ایشاں و پائمال و بے مقدار ساختن ایشاں و ایں وضع خاص در اصل بعثت آں حضرتؐ ملفوف شد و بعثت آں جناب متضمن آں صورت گشت فذلک قولہ تعالیٰ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون و قولہ صلی اللہ علیہ وسلم انما بعثتک لابتلیک و ابتلی بک (ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۴۵ مطبع صدیقی)

''اور وہ خاص وضع و شکل آپ کے دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنا ہے۔ اس طریقے پر کہ ان ادیان باطلہ کے حامیوں اور داعیوں کو قتل اور قید کیا جائے ان سے خراج اور جزیہ وصول کیا جائے ان کی حکومت و شوکت کو ختم اور ان کو پامال و ذلیل کیا جائے، اور یہ وضع خاص آپ کی اصل بعثت کے اندر داخل اور آں حضورؐ کی بعثت اس خاص صورت پر مشتمل تھی اور یہی مطلب ہے اس آیت کا ''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ اور یہی مطلب ہے حضورؐ کی اس حدیث قدسی کا کہ میں نے تم کو اس لیے بھیجا ہے کہ تمھیں آزماؤں اور تمھارے ذریعے دوسرے لوگوں کی آزمائش کروں۔''

اسی آیت پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

''جان لینا چاہیے کہ اس آیت کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ ہر غلبہ جو دین حق کو حاصل ہوا وہ سب کا سب لیظھرہ علی الدین کلہ میں داخل ہے اور وہ عظیم الشان غلبہ جو کسریٰ و قیصر کی حکومتوں کو درہم برہم کر دینے کی شکل میں حاصل ہوا بدرجہ اولیٰ اس کلمہ میں داخل ہے اور بڑے درجے و مرتبے

کے علم بردار خلفاء تھے (رضی اللہ عنہم) ان بزرگوں کی کوششیں آں حضرتؐ کی بعثت کا مقتضا اور اس کے اندر داخل تھیں۔ (ازالۃ الخفاء، جلد ۱، ص ۲۶)

بعض وہ لوگ جو غلبۂ دین حق سے مایوس ہیں یا اس کی جدوجہد سے جان بچانا چاہتے ہیں اس آیت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حضورؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب ہم اس جدوجہد کے مکلّف نہیں ہیں۔ ان کی اس ذہنیت کا جواب بھی شاہ صاحب کی تحریر میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور دین حق آں حضرتؐ پر نازل فرمایا اور آپؐ نے صحابہ کرام کو اس کی تبلیغ کی۔ صحابہ نے آپ کے مقصد و مراد کو اچھی طرح سمجھا اور پھر اسے تابعین تک پہنچایا اور اسی طرح عہد بہ عہد وہ مقصد منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اس لیے کہ ارادۂ الٰہی محض یہ نہ تھا کہ صرف آں حضرتؐ کو تعلیم دے دی جائے اور نہ یہ تھا کہ سننے والے مقصدِ تبلیغ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ آپ عہدۂ تبلیغ سے عہدہ برآ ہو جائیں بلکہ مراد دین حق کا ظہور اور غلبہ ہے۔ قرناً بعد قرنٍ (یعنی ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں اور پھر تیسرے میں اور اسی طرح)۔'' (ازالۃ الخفاء، جلد ۱، ص ۴۶)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' میں متعدد ابواب میں اور مختلف انداز سے بار بار یہ حقیقت دہرائی ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو اقامتِ دین ہی کے لیے مبعوث فرماتا رہا ہے اور اس نے سیدنا محمد ﷺ کو بھی اسی لیے مبعوث فرمایا تھا کہ وہ دین حق کو باطل ادیان پر غالب کریں۔ ابواب الایمان کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

اعلم ان النبی ﷺ لما کان مبعوثا الی الخلق عاما لیغلب دینہ علی الاَدیان کلھا بعز عزیز و ذل ذلیل حصل فی دینہ انواع من الناس فوجب التمییز بین الذین یدینون دین الاسلام و بین غیرھم الخ (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۶۲، مطبوعہ مصر)

''جان لو کہ نبی ﷺ چوں کہ تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں تا کہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں، عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ اس لیے آپ کے دین میں مختلف قسم کے لوگ داخل ہو گئے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تمیز کی جائے۔''

ایک جگہ وہ جہاد کی ضرورت و فضیلت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

اعلم ان النبی ﷺ بعث بالخلافة العامة و غلبة دینه علی سائر الادیان لا یتحقق الّا بالجهاد و اعداد الالة فاذا ترکوا الجهاد واتبعوا اذناب البقر احاط بهم الذل وغلب اهل سائر الاَدیان.

(حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۲ص ۱۷۳)

”جان لو کہ نبی ﷺ خلافت عامہ کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور آپ کے دین کا دوسرے تمام ادیان پر غالب ہونا جہاد اور سامان جہاد کی تیاری کے بغیر ممکن نہیں ہے تو جب وہ جہاد ترک کر دیں اور بیلوں کی دموں کے پیچھے لگ جائیں (یعنی وہ صرف حصولِ معاش میں مشغول اور جہاد سے غافل ہو جائیں) تو ذلت ان کو گھیر لے گی اور دوسرے ادیان والے ان پر غالب آ جائیں گے۔“

ہم طوالت کے خوف سے اس طرح کی دوسری عبارتیں نقل نہیں کر رہے ہیں، جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے پورے عزم اور یقین کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت کا مقصد دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا تھا۔ ہم مسلمانوں کے لیے اقامتِ دین کے فرض و واجب ہونے کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہم جس رسول کی امت ہیں ان کی بعثت کا مقصد ہی اقامت دین تھا۔

تیسری دلیل

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرماتا تھا اس کا ماخذ اور سرچشمہ وہ کتابیں ہوتی تھیں، جو ان پر نازل کی جاتی تھیں اور دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے اور اسے قائم کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب برحق کو قائم اور نافذ کیا جائے۔ ان کتابوں کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسان نے ظلم و زیادتی اور اپنی خواہشات نفس کے تحت دین میں جو اختلافات پیدا کر دیے ہیں، انھیں دور کیا جائے۔ اس نے شرک اور کفر و معصیت کا جو نظام قائم کر دیا ہے اس کو ختم کر کے از سر نو توحید اور ایمان و اطاعت کا نظام قائم کیا جائے اور اسے تاریک وادیوں سے نکال کر دین حق کی سیدھی اور روشن شاہراہ پر واپس لایا جائے۔ ان کتابوں کی حیثیت سلطان کائنات کے فرامین کی تھی جن پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا رسولوں پر بھی فرض تھا اور ان لوگوں پر بھی جن کی ہدایت کے لیے وہ مبعوث کیے گئے تھے۔ رسول آتے

رہے اور کتابیں اُترتی رہیں یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ اب اللہ کا آخری رسول اور نبی مبعوث ہو اور اس کی آخری کتاب نازل ہو۔ اللہ کے وہ آخری نبی اور رسول سیدنا محمد ﷺ ہیں اور اس کی آخری کتاب 'قرآن مجید' ہے۔ اب قیامت تک یہی کتاب حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی ہے اور یہی وہ فرقان ہے، جس کے احکام تمام بنی نوع انسان کے لیے واجب التعمیل ہیں۔ جب توریت نازل ہوئی تھی تو اس کی اقامت کا نام اقامت دین تھا اور جب انجیل نازل ہوئی تھی تو اس کی اقامت کا نام بھی اقامت دین تھا اور اب قیامت تک قرآن کی اقامت کا نام بھی اقامت دین ہے۔ خود قرآن نے اہل کتاب کے بارے میں کہا ہے:

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدۃ:۶۶)

”اور اگر وہ توریت و انجیل اور جو کچھ ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے قائم رکھتے تو رزق ان کے اوپر سے برستا اور نیچے سے اُبلتا۔“

اس آیت میں توریت و انجیل کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل کتاب راست بازی کے ساتھ اس دین کی پیروی پر قائم رہتے، جو توریت و انجیل اور دوسری آسمانی کتابوں میں ہے اور اسے اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے رہتے تو اس دنیا میں بھی رزق ہر طرف سے ان پر برستا اور اُبلتا۔ پھر اسی سورہ میں آگے آیت ۶۸ میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس پر غور کیجیے کہ صرف انھیں کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی کتنی اہم ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (المائدۃ:۶۸)

”کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم کسی راہ پر نہیں ہو یہاں تک کہ تم توریت و انجیل کو قائم کرو اور اس کو قائم کرو، جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے۔“

بہت سے مفسرین کے نزدیک وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد قرآن عظیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہلِ کتاب سے جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک تم توریت و انجیل و قرآن کی اقامت نہ کرو اس وقت تک تم دینی و مذہبی لحاظ سے کچھ نہیں ہو اور تمھاری دینی زندگی صفر اور لاشئے محض ہے۔ کھلی بات ہے کہ توریت و انجیل اور اس کے بعد جب قرآن نازل ہوا تو اس پر ایمان لا کر اس کی

اقامت یعنی اس کے تمام احکام کی مخلصانہ پیروی ان پر فرض ہے اور اسی فریضے کو ترک کرنے کی وجہ سے ان کی دینی زندگی لاشئے محض ہوگئی ہے۔ اگر ان پر کتاب اللہ کی اقامت فرض نہ ہوتی تو انھیں لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ (تم کسی راہ پر نہیں ہو) کہنا کسی طرح صحیح نہ ہوتا۔ دیگر دلائل کے علاوہ یہ آیت بھی اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ جو شخص بھی اللہ کی کتاب پر ایمان کا مدعی ہو اس پر اس کتاب کی اقامت فرض ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا، اب قیامت تک اقامت قرآن ہی کا نام اقامت دین ہے۔

چند اور آیتیں

سورۃ المائدہ کی ان دو آیتوں میں خطاب اہل کتاب سے تھا، ان کے علاوہ عمومی اور کلی انداز میں تمام آسمانی کتابوں کے نزول کی غرض وغایت سے متعلق قرآن مجید میں بیسیوں آیتیں موجود ہیں۔ ہم دو آیتیں اور ان کا ترجمہ یہاں نقل کرتے ہیں:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ○

(البقرۃ: ۲۱۳، ۲۱۴)

"ابتدا میں تمام انسان ایک ہی دین وملت پر تھے۔ (پھر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا) تب اللہ نے اپنے نبی بھیجے، جو بشارت اور ڈراوا سنانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوگئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جاچکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایت پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لائے انھیں اللہ نے اپنے اذن سے حق کا راستہ دکھادیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یوں ہی جنت میں داخل ہوجاؤ گے حالاں کہ ابھی تم پر

وہ سب نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ان دو آیتوں سے مندرجہ ذیل چار باتیں بہ وضاحت معلوم ہوتی ہیں:

(الف) دنیا میں بنی نوع انسان نے اپنا سفر حیات حق کی روشنی میں شروع کیا تھا، حق کا علم پالینے کی وجہ سے انسانی گروہ عرصۂ دراز تک ایک ہی ملت اور ایک ہی امت بنا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ کچھ خود غرضوں کی نفسانیت، ایک دوسرے پر زیادتی اور ذاتی مفاد کے جھگڑوں نے وحدت ملت کو پارہ پارہ کردیا اور دین حق میں اختلافات پیدا کردیے، لیکن اللہ تعالیٰ چوں کہ رحمان ورحیم ہے اس لیے اس نے انسانوں کو تباہ وبرباد ہونے کے لیے بے سہارا نہ چھوڑا بلکہ ان کی اصلاح و فلاح کے لیے اپنے برگزیدہ بندے مبعوث کیے۔

(ب) تمام انبیاء اور رسولوں کے ساتھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب برحق بھی ہوتی تھی، جو عقائد واعمال کے تمام اختلافات ونزاعات کے لیے قاضی اور حاکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ انبیاء صرف اسی لیے نہیں بھیجے جاتے تھے کہ خوش خبری اور ڈراوا سنا دیں بلکہ انھیں کتاب برحق دے کر اس بات پر بھی مامور کیا جاتا تھا کہ وہ تمام اختلافات کو مٹا کر لوگوں کو پھر اسی دین حق پر جمع کردیں، جس میں اختلاف پیدا کرکے وہ الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ زندگی کا کوئی معاملہ بھی ہو صرف اس کتاب کو یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے صحیح یا غلط، حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کرے۔

(ج) سیدنا محمد ﷺ پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کرکے بتایا گیا ہے کہ اگلی امتوں نے اپنے وقت کے رسولوں اور خدا کی کتابوں کو اپنا قاضی وحاکم آسانی سے تسلیم نہیں کیا اور یہ راہ پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی۔ یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ تم سے پہلے کے داعیانِ حق نے اس راہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں اور دشمنانِ حق کے نرغے میں اس طرح ہلا مارے گئے ہیں کہ اہل ایمان کے ساتھ وقت کے رسول تک چیخ اُٹھے ہیں۔ پھر تم کس بنا پر توقع رکھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے وہ تم پر نہیں گزرے گا۔

(د) اللہ کے باغیوں سے کش مکش اور کتاب برحق کی اقامت کی تنفیذ کی تمام سعی و جہد کا مقصود دخول جنت کا استحقاق ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کے ٹکڑے سے ایک

بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں جان کھپانے والوں کا محرک عمل اور اصل مطمح نظر اللہ کی خوش نودی اور جنت کا حصول ہے۔ اور دوسری یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جنت کا حصول اقامت دین کے ساتھ وابستہ ہے، خدا کے نازل کردہ قانون پر لوگوں کو جمع کرنے کی جدوجہد سے دامن کشی کے باوجود رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کی توقع صحیح نہیں ہے۔

اللہ کے بھیجے ہوئے تمام احکام کی پیروی اور انھیں نافذ کرنے کے لیے سیاسی طاقت ضروری ہے، اس کا واضح اشارہ ذیل کی آیت میں کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (الحدید:۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں۔ اور ان پر ہم نے لوہا اُتارا اور اس میں سخت جنگ کا سامان ہے اور لوگوں کے لیے اس میں کچھ دوسرے فائدے ہیں اور اس لیے کہ اللہ جان لے کہ بن دیکھے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور زبردست ہے۔"

اس آیت میں کتاب اور میزان بھیجنے کی غرض وغایت یہ بیان کی گئی ہے کہ ظالم انسان ظلم کی روش ترک کر کے عدل وانصاف کی روش پر قائم ہو جائیں لیکن ظلم وجور کا استیصال اور عدل وانصاف کا قیام قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے آیت کے دوسرے ٹکڑے میں لوہے کی تخلیق کے تین اغراض بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے آلات حرب اور سامانِ جنگ تیار کیے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس کے علاوہ کچھ دوسرے منافع بھی ہیں اور تیسری غرض یہ ہے کہ اس قوت سے اللہ کے دین کی مدد کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کتابیں جس عدل کو قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں اس کو قائم کرنے اور باقی رکھنے کے لیے قوت اور اقتدار ضروری ہے۔ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ کے تحت علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

فیه اشارة الی احتیاج الكتاب والمیزان الی القائم بالسیف لیحصل القیام بالقسط فان الظلم من شیم النفوس.

(روح المعانی، جلد ۲۷، ص ۱۸۸، مطبوعہ مصر)

"یہ اشارہ ہے اس بات کا کہ کتاب ومیزان بااقتدار حاکم کے محتاج ہیں تا کہ عدل کا قیام ممکن ہو سکے کیوں کہ بہت سے انسان ظلم کو اپنی عادت وخصلت بنالیتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اللہ کی کتاب بذاتِ خود عدل قائم نہیں کر سکتی بلکہ وہ حکومت قائم کر سکتی ہے، جو اس پر ایمان لائی ہو۔ یہی بات حافظ ابن کثیرؒ نے سورۂ حدید کی اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے لکھی ہے:

لابد مع الحق من قهر لمن عاداه وناواه (تفسیر ابن کثیر، مطبوعہ مصر، ج ۴، ص ۵۹)

"حق کے دشمنوں اور مخالفوں کی سرکوبی کے لیے قہر وغلبہ ضروری ہے۔"

اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ:

ان اللّٰه لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۵۹)

"بے شک اللہ تعالیٰ اقتدار کے ذریعے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے، جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔"

کھلی بات ہے کہ قرآن خود کسی ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا، کسی زانی کی پیٹھ پر کوڑے نہیں برسا سکتا، اور کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ اس کے احکام کی تنفیذ کے لیے حکومت کا اقتدار ضروری ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت بذاتِ خود مقصود ومطلوب نہیں ہے بلکہ اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے مطلوب ہے، جو اللہ نے انسانوں کی دنیوی واُخروی فلاح کے لیے نازل فرمایا ہے اور یہیں سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو حکومت طلب کرنے کی دعا کیوں سکھائی تھی۔ اس موقع پر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۰ اور اس کی تفسیر کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

چوتھی دلیل

سورۃ المائدہ رکوع ۷ میں توریت نازل کرنے، انبیاء بنی اسرائیل اور ان کے علماء وفقہاء کے مطابق توریت فیصلوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المائدہ:۴۴)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔"

پھر آیت ۴۵ میں توریت کے قانون قصاص کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (المائدہ:۴۵)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔"

آیت ۴۶ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور نزول انجیل کا ذکر کر کے آیت ۴۷ میں

کہا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (المائدہ: ۴۷)

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔''

یہ آیتیں ایک طرف اس بات کی محکم دلیل ہیں کہ تمام معاملات ومقدمات میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا اس درجے کا فرض ہے کہ اس پر عمل نہ کرنے والا کافر، ظالم اور فاسق ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ اس حقیقت کی بھی پختہ دلیل ہیں کہ دین میں معاملات کی اہمیت عبادات سے کم نہیں ہے اور دین کا وہ جز جس کا تعلق سیاست وحکومت سے ہے اُتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا وہ جز جس کا تعلق اللہ کی پرستش سے ہے۔ اور تیسری طرف یہ آیتیں اس بات کی بھی شاہد عدل ہیں کہ اقامت دین، حکومت وعدالت کی کرسیوں پر اتنی ہی ضروری ہے جتنی مسجد کی صفوں اور چٹائیوں پر ___ البتہ یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں اور ہر صورت کا حکم الگ ہے۔ میں اس کی توضیح تفہیم القرآن سے نقل کرتا ہوں۔

''جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر ظالم اور فاسق ہے اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کرلیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر وظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے، جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔''

(تفہیم القرآن: ج ۱ص ۴۷۶)

بعض لوگ یہ خیال کرسکتے ہیں کہ کافر، ظالم اور فاسق تو ان اہل کتاب کو کہا گیا ہے، جو توریت وانجیل کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کو خطاب نہیں کیا گیا ہے۔ اس شبہے کا جواب خود ان آیتوں میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے لوث قانون عدل میں بھی موجود ہے اور صحابہ وتابعین کی توضیحات میں بھی۔

ان آیتوں میں اس کا یہ جواب موجود ہے کہ ہر جگہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے) کے عام الفاظ کہے گئے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ''جو

توریت کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔'' اور ''جو انجیل کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ فاسق ہے'' بلکہ الفاظ عام رکھے گئے ہیں، جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر بھی بدرجہ اولیٰ صادق آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بے لوث عدل کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں سے اس کا کوئی خاص رشتہ نہیں ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ کو توریت وانجیل کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر کافر، ظالم اور فاسق قرار دے اور مسلمانوں کو قرآن کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر مومن، عادل اور اطاعت گزار قرار دے۔

صحابہ وتابعین کی توضیحات میں یہ جواب موجود ہے کہ انھوں نے ان آیتوں کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے۔ ایک بار حضرت علقمہ ومسروق نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے رشوت کا حکم دریافت کیا۔ انھوں نے کہا وہ حرام ہے۔ ان دونوں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ اگر کسی معاملے کا فیصلہ کرنے میں رشوت ستانی ہو تو؟ انھوں نے جواب دیا یہ کفر ہے اور وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ کی تلاوت کی۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۶۱) اور امام شعبیؒ تو یہ کہتے تھے کہ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ والی آیت مسلمانوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ غالباً انھوں نے یہ شدت اس لیے اختیار کی ہوگی کہ کہیں مسلمان اپنے آپ کو اس حکم سے خارج نہ سمجھنے لگیں۔ ایک بار کسی نے حضرت حذیفہؓ سے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لیے۔ ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم انھی کے طریقے پر قدم بقدم چلو گے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۴۷۶)

ان تین آیتوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم نے تم پر جو کتاب برحق نازل کی ہے تم خدا کے نازل کردہ اسی قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ پھر آیت ۴۹ میں قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کا دوبارہ حکم دینے کے بعد یہ بھی کہا گیا ہے:

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (المائدہ: ۴۹)

''اور ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت کے کسی حکم سے بھی منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔''

آیت کا یہ ٹکڑا ہمارے لیے قابل غور ہے اس میں قرآن کے بعض احکام سے انحراف کو پوری تاکید کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے نازل کردہ قانون کی مکمل پیروی کی جائے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دشمنان حق اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اگر وہ مومن کو قرآن سے بالکلیہ منحرف نہیں کر سکتے تو کم سے کم اس کے بعض احکام ہی سے منحرف کر دیں۔ آگے کہا گیا ہے:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ○ (المائدۃ:۵۰)

"(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔"

اس آیت کے تحت ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ چنگیز خاں نے اپنی حکومت کے لیے جو مجموعہ احکام تیار کیا تھا وہ اس کے خاندان کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی نافذ رہا۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ مجموعہ احکام اب اس کے خاندان کے مسلمان سلاطین و حکام کے نزدیک وہ اصل شریعت ہے، جس کی وہ اتباع کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے احکام کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے احکام پر مقدم رکھتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ کافر ہے۔ اس سے اس وقت تک مقابلہ واجب ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف پلٹ نہ آئے اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں انھیں کے مطابق فیصلہ نہ کرنے لگے۔" (تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۶۷)

پانچویں دلیل

یہ ہے اقامت دین کا وہ مطالعہ اور وہ مفہوم، جو قرآن ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ، راستوں کا امن اور انسانی اخلاق و کردار کو بگاڑ سے بچانے کا اہتمام، ایک مہذب انسانی معاشرے کے لیے جس قدر ضروری ہے اس سے ہر صاحب فہم انسان واقف ہے۔ ان تحفظات کے بغیر نہ انسانی نفس کی تکمیل آسان ہے، نہ صالح اجتماعیت کی بقا ممکن ہے اور نہ انسانیت کا اپنے معراج کمال تک ترقی کرنا سہل ہے۔ بلاشبہ اسلام جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے اور موت کے بعد دوسری زندگی اور آخرت کے ابدی عذاب و ثواب کی جس حقیقت کو انسانی دل و دماغ میں پیوست کرتا ہے وہ ان تحفظات کی اصل ضمانت ہیں۔ لیکن محض عقائد سے ظلم و جور اور برائیوں کا استیصال ممکن نہیں، ہے اس لیے اس نے عقائد کے ساتھ ان تحفظات کے حصول کے لیے حدود و تعزیرات بھی مقرر کی ہیں

اور امن و امان کو باقی رکھنے اور جرائم کا انسداد کرنے کے لیے قوانین بھی دیے ہیں اور جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے اس نے ان حدود و قوانین کی تنفیذ کو عبادات کی ادائی سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ اس لیے جب تک ان حدود و قوانین کی تنفیذ نہ ہو اقامتِ دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ حکومت و سیاست کے باب سے متعلق قرآن مجید میں بہت سے احکام دیے گئے ہیں۔ میں یہاں ان میں سے صرف دو حکم پیش کرتا ہوں۔ چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم اور زانی کی پیٹھ پر کوڑے لگانے کا حکم۔

سورۃ المائدہ میں چور کی سزا کا حکم دینے سے پہلے قطّاع الطریق یعنی رہزنوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔ میں پہلے وہ آیات اور ان کا ترجمہ یہاں نقل کرتا ہوں تاکہ رہزنوں اور چوروں کی سزاؤں کے درمیان مناسبت کا احساس تازہ ہو جائے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (المائدۃ:۳۳، ۳۴)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ لیے جائیں یا جلا وطن کر دیے جائیں، یہ ذلت اور رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔"

یہ سزا رہزنوں اور ڈکیتوں کی بھی ہے۔ اسلامی حکومت کے باغیوں اور اس نظام کو اُلٹنے کی سعی کرنے والوں کی بھی ہے اور بعض علماء کے نزدیک مرتدوں کی بھی ہے۔ ان سزاؤں کی تفصیل اور فقہی احکام و مباحث پیش کرنا اس وقت میرے موضوع سے خارج ہے۔ ان آیتوں کے بعد چوروں کے بارے میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

وَ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ

اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ○ (المائدۃ:۳۸)

"اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا اور اللہ غالب اور دانا و بینا ہے۔"

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ○ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّلَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَلۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○ (النور:۱،۲)

"یہ ایک سورہ ہے، جس کو ہم نے نازل کیا ہے اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں۔ شاید تم سبق لو۔ زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔"

اس سورہ کی پرزور تمہید میں یہ بات پوری وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے کہ اس میں جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ فرض ہیں اور جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر ان احکام کی تعمیل واجب اور لازم ہے۔ اس کے بعد فوراً ہی زانیہ عورت اور زانی مرد کو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ان حدود کو نافذ کریں۔

سورۂ مائدہ اور سورۂ نور کی ان آیتوں میں امت مسلمہ بحیثیت مجموعی مخاطب ہے لیکن حد نافذ کرنا حکومت کا کام ہے کیوں کہ ہر شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت دے دی جائے تو سخت افراتفری پھیل جائے اور اجتماعیت منتشر ہو کر رہ جائے۔ ان حدود کو مسلمانوں کی نیابت میں ان کے حکام نافذ کریں گے۔ مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ جہاں ان کی حکومت قائم ہو وہ وہاں یہ دیکھتے رہیں کہ قرآن و سنت میں مقرر کی ہوئی حدود و تعزیرات نافذ ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اگر نافذ ہو رہی ہوں تو اپنی حکومت کو انھیں نافذ کرنے پر مجبور کریں گے اور اگر وہ تیار نہ ہو تو اسے بدل دینے کی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور اگر کسی ملک میں کوئی ایسا سیاسی اقتدار موجود ہی نہ ہو، جو قرآن کے ان حدود کی تنفیذ کر سکے تو دعوت اسلامی کے اوّلین مرحلے سے لے کر آخری مراحل تک ایک ایسے سیاسی اقتدار کے حصول کی جدوجہد واجب ہوگی۔

چھٹی دلیل

قرآن کریم کی وہ آیت، جس سے اقامت دین کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے:

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ (الشوریٰ:۱۳)

"تمہارے لیے وہ آئین مقرر کیا، جس کی اقامت کا حکم دیا تھا نوح کو اور جس کے لیے ہم نے وحی بھیجی ہے تمہاری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ قائم کرو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو۔"

ہم نے یہاں جو ترجمہ دیا ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔ انھوں نے اس آیت کا فارسی میں جو ترجمہ کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"مقرر کرد برائے شما از آئین انچہ امر کردہ بود با قامت آں نوح را وانچہ وحی فرستادیم بسوئے تو وانچہ امر کردیم با قامت آں ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ بایں مضمون کہ قایم کنید دین را و متفرق مشوید در آں۔" (فارسی ترجمہ قرآن شاہ ولی اللہؒ)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اس ترجمہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے دین کا ترجمہ "آئین" کیا ہے اور دوسری یہ کہ انھوں نے اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ کا ترجمہ کیا ہے "قائم کرو دین کو۔" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا وہ انسانی زندگی کا آئین و قانون تھا جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح کے لیے نازل کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے کہ "اقامت دین" کی اصطلاح ایک ایسی جامع کلی ہے، جس نے دین کی تمام کلیات و جزئیات کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ بات گزشتہ صفحات میں واضح کی جا چکی ہے کہ حضرت آدم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام خلافت الٰہی کے عظیم منصب پر فائز تھے۔ شاہ صاحب نے خلافت کی تعریف اور اس کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ملت محمدیہ میں یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ جب آں حضرت ﷺ اللہ کی تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیے گئے تو آپ نے ان لوگوں کے ساتھ جن کی طرف مبعوث کیے گئے تھے بہت سے معاملات و تصرفات کیے اور ہر معاملے کے لیے آپ نے اپنے نائبین مقرر کیے اور تمام معاملات کی انجام دہی میں بے حد اہتمام فرمایا۔ جب ہم ان معاملات کا جائزہ لیتے ہیں

اور جزئیات سے کلیات کی طرف اور کلیات سے کسی ایسی کلی کی طرف منتقل ہوتے ہیں، جو سب کو حاوی و شامل ہو تو اس واحد کلی کی جنس اعلیٰ ''اقامت دین'' قرار پاتی ہے، جو تمام کلیات کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے تھے اور اس جنس اعلیٰ کے تحت دوسری اجناس ہیں۔''
(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ج ۱، ص ۲۱)

اپنے زمانے کی علمی و منطقی زبان میں حضرت شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے بحیثیت نبی بہت سے کام انجام دیے ہیں ان میں سے بہت سے امور اصول اور قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص ان تمام امور و معاملات کو کسی ایک اصطلاح میں جمع کرنا چاہے تو وہ اصطلاح ''اقامت دین'' ہی ہوگی، جس شخص کی بھی احادیث، تفسیر، فقہ، تاریخ اور پورے اسلامی لٹریچر پر نظر ہوگی وہ شاہ صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرے گا کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد صحابہ سے لے کر آج تک تمام علمائے امت دین اسلام کی ترویج و تنفیذ کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔

''اقامت دین'' کی جامع اصطلاح کے تحت جو امور و معاملات اور کلیات و جزئیات داخل ہیں ان میں سے دو اصولی امور کا ذکر شاہ صاحب نے کیا ہے:

''ان میں سے ایک علوم دینیہ کی اشاعت، قرآن و سنت کی تعلیم اور تذکیر و موعظت ہے۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲) (وہی ہے جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اور یہ بات معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ اپنے صحابہ کو نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ دوسری چیز ارکانِ اسلام کی اقامت ہے، اس لیے کہ یہ بات بھی معلوم و معروف ہے کہ آپ جمعہ، عیدین اور پنج وقتہ نمازوں کی اقامت خود کرتے تھے اور ہر مقام پر ائمہ کا تقرر فرماتے تھے، تحصیل زکوٰۃ کے لیے اپنے عمال بھیجتے اور زکوٰۃ کو اس کے مصارف میں خرچ کرتے، اسی طرح رمضان اور عید کی رویتِ ہلال کی شہادت سماعت فرماتے اور ثبوت شہادت کے بعد صوم و فطر یعنی روزہ رکھنے اور اسے ختم کرنے کا حکم دیتے۔ آپ نے بہ نفس نفیس حج کی امامت کی (یعنی اپنی قیادت و امامت میں لوگوں کو فریضۂ حج ادا کرایا) اور ۹ ھ میں آپ حج کے لیے تشریف نہ لے جا سکے تو حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر فرمایا تاکہ وہ حج کی اقامت کریں، اسی طرح جہاد کی اقامت، اُمراء کا تقرر، جہاد کے لیے فوجوں اور فوجی دستوں کو

بھیجنا، خصومت اور نزاع میں فیصلے کرنا اور بلاد اسلامی میں قاضیوں کو مقرر کرنا، شرعی حدود کو نافذ کرنا، معروف کا حکم دینا، منکر سے روکنا، ان کے درجات معروف و معلوم ہیں۔ محتاج بیان نہیں ہیں۔ پھر جب آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے تو اقامت دین اسی تفصیل کے ساتھ جو اوپر گزری، آں حضرت ﷺ کے بعد کے لوگوں پر واجب ہوئی۔
(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ج ۱، ص ۳)

شاہ صاحب کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے تعلیم قرآن و سنت اور تذکیر و موعظت کی مجلسوں سے لے کر بدر و حنین اور خیبر و تبوک کے میدانوں تک اور تبلیغ دین سے لے کر انتظام مملکت تک جو کام بھی کیا وہ سب اقامت دین میں داخل تھا اور اس کا کوئی جز و دین اسلام سے خارج نہ تھا۔

شریعتوں کے درمیان اختلاف محض جزوی تھا

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس سے معلوم ہوا کہ اقامت دین انبیائے کرام علیہم السلام پر فرض تھا اور سیدنا محمد رسول اللہؐ کے بعد آپ کی امت پر اسی تفصیل کے ساتھ فرض رہی، جس تفصیل کے ساتھ آپ پر فرض تھی۔ اب یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی شریعتوں میں اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟ اِسے واضح کرنے کی ضرورت اس شبہے کی وجہ سے پیش آتی ہے کہ اقامت دین کی آیت میں پانچ انبیاء اولوالعزم، حضرت نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین کے نام لے کر انھیں اقامت دین کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اگر دین کی اقامت میں شریعت کی اقامت کو بھی داخل مانا جائے تو یہ بات صحیح نہ ہوگی۔ اس لیے کہ شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ اس شبہے کو دور کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے ایک مستقل باب میں سورۃ الشوریٰ کی زیر بحث اَقِیْمُوا الدِّیْنَ والی آیت نقل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا اس میں کون کون سی چیزیں ہمیشہ داخل رہی ہیں اور یہ کہ شریعتوں کے مختلف ہونے کا مطلب کیا ہے اور اختلاف کی نوعیت کیا رہی ہے؟ انھوں نے اصل دین کی جس پر تمام انبیاء کرام متفق رہے ہیں۔ توضیح کرتے ہوئے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق عقیدے اور دوسرے عقائد کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اعمال صالحہ میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کے فرائض اور دعا، ذکر، تلاوت کتاب اللہ اور دوسرے نوافل بیان کیے ہیں۔ عقائد اور ان اعمال کی تفصیل کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی اپنی عبارت میں یہ ہے:

وكذالک اجمعوا على النكاح و تحريم السفاح و اقامة العدل بين الناس و تحريم المظالم و اقامة الحدود على اهل المعاصى والجهاد مع اعداء الله والاجتهاد فى اشاعة امر الله و دينه فهٰذا اصل الدين و لذالک لم يبحث القراٰن عن لمية هٰذه الأشياء فانها كانت مسلمة فيمن نزل القراٰن علٰى السنتهم و انما الاختلاف فى صور هٰذه الأمور واشباحها.

(حجة الله البالغه، جلد۱، ص ۸)

''اور اسی طرح مشروعیت نکاح، تحریم زنا، لوگوں کے درمیان اقامت عدل، تحریم مظالم، مجرموں پر حدود کی تنفیذ، اللہ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد، اوامر الٰہی اور اس کے دین کی اشاعت میں جدوجہد پر متفق رہے ہیں۔ لہٰذا یہ ہے اصل دین، اور اسی لیے قرآن عظیم نے ان اشیاء کی لمیت سے بحث نہیں کی الا ماشاء اللہ، کیوں کہ جن لوگوں کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا ان کے نزدیک یہ سب چیزیں تسلیم شدہ تھیں اور شریعتوں کے درمیان اختلاف جو کچھ تھا ان امور کی صورتوں اور ہیئتوں میں تھا۔''

شاہ صاحب کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ اللہ کی بھیجی ہوئی تمام شریعتیں اقامت عدل، اقامت حدود اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے انتہائی اور آخری سیاسی و اجتماعی احکام تک میں متفق تھیں اور یہ سب احکام اصل دین میں داخل تھے۔ اختلاف جو کچھ تھا محض جزوی تھا۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے جزوی اختلاف کی چند مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے:

''موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ بیت المقدس تھا اور ہمارے نبی ﷺ کی شریعت میں کعبہ ہے۔ ان کی شریعت میں زانی کی سزا صرف رجم (پتھر مار کر ہلاک کردینا) تھی اور ہماری شریعت میں شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے اور غیر شادی شدہ زانی کی سزا کوڑا ہے۔ ان کی شریعت میں صرف قصاص کا حکم تھا اور ہماری شریعت میں قصاص اور دیت دونوں کا حکم آیا۔ اسی طرح ان کے درمیان عبادات کے اوقات اور ان کے آداب و ارکان مختلف رہے ہیں۔'' (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱ ص ۸۷)

عبارت کا حاصل یہ ہے کہ جس دین کی اقامت کا حکم انبیائے کرامؑ کو دیا گیا تھا اس میں مثال کے طور پر نماز کی اقامت یقیناً داخل تھی۔ حالاں کہ نماز کے قبلہ، اس کے آداب اور اوقات میں اختلاف موجود تھا تو کیا اس جزوی اختلاف کی وجہ سے یہ کہنا صحیح ہوسکتا ہے کہ اقامت دین کے حکم سے

نماز خارج تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب علم یہ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح شرعی حدود قائم کرنے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے کا حکم بھی جزوی اختلاف کے باوجود اقامت دین کے کلی حکم میں داخل تھا۔

یہ بات ہر شبہے سے بالاتر ہے کہ سورۃ الشوریٰ کی آیت شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ میں جس ''الدین'' کی اقامت کو فرض قرار دیا گیا ہے وہ صرف عقائد و عبادات ہی نہیں بلکہ دین و شریعت کے پورے مجموعے پر حاوی تھا خواہ اس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے۔

ساتویں دلیل

قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں ہم یہ پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو کفر و شرک کی طاقت کے مقابلے میں جب بھی بھیجا اپنی مدد کا وعدہ کرکے بھیجا اور حق و باطل کی کشمکش کے ہر نازک موڑ پر تسلی دے کر ان کے حوصلوں کو برقرار رکھا اور انھیں دشمن حق طاقت کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے اور اس راہ میں ہر مصیبت جھیل جانے کا حکم دیا ہے۔ مشکلات میں صبر اور غلبۂ حق کے لیے اللہ کی مدد کا وعدہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ذمے جو کام کیا گیا تھا وہ ان پر فرض تھا اور وعدۂ الٰہی کی جو آیتیں ہیں ان کے الفاظ بھی یہ بتاتے ہیں کہ انبیاء کے ذمے جو کام کیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ دین حق کو باطل ادیان پر غالب کیا جائے۔ اس سلسلے کی جو آیتیں ہیں انھیں ہم چار قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱- وہ آیتیں جن میں عمومی طور پر تمام رسولوں سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ہم تمھیں کفار پر غالب کریں گے۔

۲- وہ آیتیں جن میں خصوصی طور پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے وعدہ کیا گیا ہے۔

۳- وہ آیتیں جن میں سیدنا محمد ﷺ سے وعدہ کیا گیا ہے۔

۴- وہ آیتیں جن میں امت مسلمہ سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ہم طوالت سے بچنے کے لیے ان چار قسم کی آیتوں میں سے صرف ایک ایک آیت یہاں پیش کریں گے:

۱- وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۱۷۱-۱۷۳)

"اور اپنے بندوں (یعنی رسولوں) کے حق میں ہمارا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہی وہ لوگ ہیں، جن کی مدد کی جائے گی اور بلاشبہ ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا۔"

ان آیتوں میں جس زور اور تاکید کے ساتھ مدد کا وعدہ کیا گیا اور غلبے کی بشارت سنائی گئی ہے اس سے عربی جاننے والے واقف ہیں۔ ان آیتوں سے کئی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں:

الف۔ تمام رسولوں سے یہ اللہ کا غیر متبدل وعدہ اور اس کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ وہ باطل پرست طاقتوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرے گا۔

ب۔ رسولوں اور ان پر ایمان لانے والے داعیان حق کی حیثیت ایسے واعظوں کی نہیں، جن کا کام وعظ کہنے پر ختم ہو جاتا ہو بلکہ ان کی حیثیت فرماں روائے کائنات کے لشکر کی ہوتی ہے، جو اس کے باغیوں کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔ اور یہ صف آرائی دین حق کو دین باطل پر غالب کرنے کے لیے ہی ہوتی ہے، اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔

ج۔ رسول جس دین اور جس پیغام پر مامور ہوتے ہیں اس کی حیثیت کسی ایسی تبلیغ، بشارت، سفارش اور نصیحت کی نہیں ہوتی جسے رد کر دینے کے بعد اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے بلکہ ایک ایسے فرمان شاہی کی ہوتی ہے، جس کے انکار کو بادشاہ اپنے خلاف بغاوت اور چیلنج سمجھتا ہے۔

د۔ باغی لشکر کے مقابلے میں آخر کار بادشاہ کی وفادار فوج ہی غالب، کامیاب اور فاتح ہوتی ہے۔

۲۔ خصوصی طور پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا اسے سورۃ القصص کی ابتدائی آیتوں میں پڑھنا چاہیے۔ ہم یہاں چند آیتوں کا صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں:

"فرعون ملک مصر میں بڑھ چڑھ رہا تھا اور اس نے وہاں کے لوگوں کے الگ الگ گروہ قرار دیے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اس نے اس قدر کمزور سمجھ رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ رکھتا۔ بلاشبہ وہ فسادیوں میں سے ایک فسادی تھا اور ہم نے ارادہ کیا کہ جو لوگ اس ملک میں کمزور سمجھ لیے گئے تھے ان پر احسان کریں اور انھیں سردار و پیشوا بنائیں اور انھیں (سلطنت کا) وارث بنا دیں اور زمین میں ان کے اقتدار کو جما دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو بنی اسرائیل کی طرف سے جس بات کا خطرہ تھا وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ان کے سامنے لے آئیں۔" (القصص: ۴-۶)

بنی اسرائیل پر احسان کرنا، انھیں امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز کرنا، انھیں حکومت و

سلطنت کا وارث بنانا، زمین میں ان کے اقتدار کو جما دینا اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو مغلوب کرنا ــــ یہ تھا وہ ارادہ جو سلطان کائنات نے کیا ــــ اللہ کا یہ ارادہ کس طرح ظہور میں آیا؟ اس کی مفصل روداد آگے کی آیتوں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کو رسالت و نبوت عطا کر کے انھیں اس مشن کی تکمیل پر مامور فرمایا گیا اور انھیں کے ہاتھوں ارادۂ الٰہی ظہور میں آیا۔ فرعون کی جبار و زور آور حکومت کے مقابلے میں دونوں کو بھیجتے وقت جو صریح وعدہ فرمایا گیا اور جو خوش خبری سنائی گئی اس کے الفاظ یہ ہیں:

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا أَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ ٥ (القصص: ۳۵)

"فرمایا ہم تمہارے بھائی کو تمہارا قوت بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو ایسا غلبہ دیں گے کہ فرعون کے لوگ تم تک پہنچ بھی نہ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے تم دونوں اور تمہاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔"

قرآن کی ان صراحتوں کو پڑھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام باطل کو مغلوب کر کے حق کو غالب کرنے کے مشن پر مامور نہ تھے اور کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ رسالت و نبوت کے منصب سے حکومت و سلطنت کا تعلق محض ضمنی اور جزوی ہوتا ہے۔ ان آیتوں سے زیادہ واضح اور کس نص صریح کی ضرورت ہے، جو یہ بتائے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے مقصد بعثت میں غلبۂ حق اور حکومت و اقتدار کا حصول بھی داخل رہا ہے کیوں کہ حکومت کے بغیر دین حق کی کامل پیروی ممکن ہی نہیں ہے۔

۳۔ سیدنا محمد ﷺ کو مکے میں دعوت اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں یہ پر جلال شاہی اعلان سنا دیا گیا تھا:

"سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّونَ الدُّبُرَ ٥ (القمر: ۴۵)

"عن قریب ان کا جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔"

اس آیت نے ابتدا ہی میں مخاطبین قرآن پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ اسلام کی جو دعوت پیش کی جا رہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ نہ مسلمانوں کو اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی باقی رہی تھی اور نہ مشرکین غلط فہمی میں مبتلا رہتے تھے۔ اس آیت نے پکار کر کہہ دیا تھا کہ دین حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد بالسیف (تلوار سے جہاد) کا مرحلہ آ کر رہے گا اور یہ دین

غالب ہو کر رہے گا۔

۴-امت مسلمہ سے قیامت تک کے لیے جو وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ○ (محمد:۷)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدموں کو جمادے گا۔''

اپنے دین کی مدد کو اپنی مدد کہہ کر اللہ تعالیٰ نے فرماں بردار بندوں کا درجہ اتنا بڑھا دیا ہے کہ اس سے بلند کسی اور درجے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت نے وعدۂ الٰہی کی نوعیت کو بالکل واضح کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے دین کی مدد کی شرط پر یا نصرت دین کے فرض کی انجام دہی کے صلے میں اپنی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ سورۂ محمد کی اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیتوں میں اللہ کے دین کی مدد سے مراد یہ ہے کہ اسے باطل ادیان پر غالب کرنے میں اپنی جان اور اپنا مال صرف کیا جائے اور اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں اپنی کوئی چیز بچا کر نہ رکھی جائے۔ اگر مسلمانوں نے یہ ڈیوٹی انجام دی تو اللہ ان کی مدد کرے گا اور دشمنوں کے مقابلے میں انھیں ثابت قدمی عطا کر کے ان کے قدموں کو لغزش سے بچائے گا۔ یہی بات دوسرے اسلوب میں یوں کہی گئی ہے۔

وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ○

(آل عمران:۱۳۹)

''اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو۔ اگر تم مؤمن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم سچے اور پکے مومن ہو تو غلبہ اور سربلندی تمھارے ہی لیے ہے۔ تمھیں عارضی شکست سے پست ہمت نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کوتاہی کیا تھی، جس کی وجہ سے شکست ہوئی۔ کوتاہیوں کو دور کر کے اگر تم نے سچے اور پکے ایمان کا ثبوت دیا تو تمھی غالب رہو گے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا۔

وعدۂ الٰہی کی ان آیتوں نے پوری طرح یہ بات واضح کر دی ہے کہ دین کو غالب کرنے کی جدوجہد اور اس راہ میں ایثار و قربانی فرض ہے ورنہ اللہ کی مدد کے لیے یہ شرط ہرگز نہ لگائی جاتی۔

آٹھویں دلیل

اعلاء کلمۃ اللہ یعنی اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں اپنی جان چرانے والے اور

اپنا مال خرچ نہ کرنے والے منافق ہیں۔

قرآن کا ترجمہ کے ساتھ مطالعہ کرنے والے لوگ بھی اس سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ بہت سے مقامات پر منافقین کے جو عادات و خصائل اور ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ان کی دو بڑی علامتیں اور صفتیں یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ راہِ خدا میں اپنا مال خرچ نہیں کرتے اور دشمنانِ دین سے مقابلہ و مقاتلہ کرنے میں اپنی جان چراتے ہیں، اور قرآن کا مطالعہ کرنے والے اس سے بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ دین کی سربلندی کے لیے مال خرچ کرنے اور اپنی جان کھپانے کو ایمان کی کسوٹی قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کی تمام آیتوں سے روزِ روشن کی طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ راہِ خدا میں حسب استطاعت مال خرچ کرنا اور اقامت دین کی جدوجہد میں بذاتِ خود حصہ لینا ایک ایسا فریضہ ہے، جسے بلا عذر شرعی ترک کرنے کے بعد مخلصانہ ایمان باقی نہیں رہتا۔ کیوں کہ اللہ پر ایمان ایک ایسا معاہدہ و معاملہ ہے، جس میں مومن اپنی جان، اپنا مال اور سب کچھ اللہ کے ہاتھ بہ عوض جنت فروخت کر دیتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی امانت ہے۔ اب اگر کوئی مدعی ایمان اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو یہ خلوص کی علامت نہیں بلکہ نفاق ہی کی علامت ہو سکتی ہے۔ میں طوالت کے خوف سے یہاں صرف چند آیتیں پیش کروں گا۔

۱-غزوۂ احد غالباً اسلام و کفر کے درمیان وہ پہلی جنگ اور مسلمانوں کی ایک ایسی آزمائش تھی، جس میں عقیدے اور عمل دونوں ہی قسم کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ عقیدۂ منافقین کی ایک بڑی جماعت، جس کا سردار عبداللہ بن ابی تھا، اس جنگ میں شریک ہی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر راستے ہی سے پلٹ گیا اور کچھ لوگ جو عملی نفاق میں مبتلا تھے وہ مجبوراً شریک تو ہوئے لیکن بے دلی اور بزدلی کے ساتھ۔ انھیں اپنی جانوں کے سوا کوئی دوسری فکر نہ تھی۔ اس غزوہ پر مکمل تبصرہ سورۂ آل عمران میں موجود ہے۔ ہم یہاں چند آیتوں کا ترجمہ پیش کریں گے۔ بہانہ بنا کر جن لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی تھی ان کے بارے میں کہا گیا ہے:

''اور دونوں جماعتوں کے مڈبھیڑ کے دن تمھیں جو مصیبت پہنچی، یہ اللہ کے حکم سے پہنچی تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کر دے اور ان منافقین کو بھی ممیز کر دے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفع کرو۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب

جانتا ہے، جس کو یہ چھپاتے ہیں۔ یہ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ ہوتے، ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو خود اپنے آپ سے موت کو دفع کر لو۔" (آل عمران: ۱۶۶-۱۶۸)

ان آیتوں سے واضح ہوا کہ راہِ خدا میں جہاد، ایمان کی وہ کسوٹی ہے، جو مومنوں اور منافقوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دیتی ہے۔ اس جنگ میں بہانہ بنا کر راہ فرار اختیار کرنے والے منافق تھے۔ یہی بات دوسرے اسلوب میں آیت ۱۷۹ میں بھی کہی گئی ہے۔ وہاں منافق اور مومن کے بجائے خبیث اور طیب کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یعنی یہ بات اللہ کی حکمت سے بعید ہے کہ وہ خبیث (منافق) اور طیب (مومن) کو ہمیشہ ملا جلا رہنے دے۔

اہل ایمان کے لیے غزوۂ اُحد میں جو حکمت پوشیدہ تھی وہ یہی تھی کہ ناپاک وخبیث منافقوں اور پاک وطیب مومنوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دے اور اہل ایمان اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ان میں مخلص کون ہے اور منافق کون ہے؟

وہ لوگ جو بے دلی کے ساتھ شریک جنگ ہوئے تھے، ان کی ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

"اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ یہ خدا کے بارے میں خلاف حقیقت زمانہ جاہلیت کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے۔ یہ کہتے رہے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل؟ کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر اس امر میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کر رہتے۔" (آل عمران: ۱۵۴)

یہ ان ضعیف الایمان لوگوں کا نقشہ ہے جن کے دلوں میں ابھی ایمان نے گھر نہیں بنایا تھا اور زمانہ جاہلیت کے خیالات وتصورات ان کے دلوں میں موجود تھے۔ اوپر کی آیت میں ان کے تصورات خیالات کی تردید کر کے صحیح خیالات کی طرف ان کی رہ نمائی کی گئی ہے۔

اس غزوے پر تبصرہ کرتے ہوئے منافقین کی بخالت یعنی راہِ خدا میں مال خرچ نہ کرنے پر بھی تنبیہ کی گئی ہے۔

"اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے اپنے فضل میں سے بخشی ہے۔ یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے، جس چیز میں

وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔" (آل عمران: ۱۸۰)

یہ اس بات کا اظہار ہے کہ منافقین جس طرح راہِ خدا میں اپنی جان چراتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں۔ ان کی زر پرستی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ دین حق کو سربلند کرنے کے لیے اپنے اموال کو روکے رکھیں۔

غلبۂ دین یا اقامت دین کی جدوجہد کے فرض ہونے کی یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس کو ایمان کی کسوٹی اور اس راہ میں جی چرانے اور مال خرچ نہ کرنے کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

۲- ذیل کی آیت بتاتی ہے کہ بلا عذر جہاد میں شریک نہ ہونے کی رخصت طلب کرنا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ رخصت طلب کرنے والے کو اللہ اور آخرت پر یقین نہیں ہے:

لَا يَسْتَاذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ○ اِنَّمَا يَسْتَاذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ○ (التوبہ: ۴۴، ۴۵)

"جو لوگ سچے دل سے اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انھیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی رخصت تو تم سے وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں۔"

اگر اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جان و مال کے ساتھ جہاد فرض نہ ہوتا تو پھر اسے ایمان ونفاق کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی قرار نہ دیا جاتا۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اسلام وکفر کی کشمکش میں جو لوگ اپنی جان و مال کے ساتھ اسلام کی حمایت کریں اور اپنی تمام قوت وصلاحیت اسے سربلند کرنے کی کوشش میں کھپا دیں وہی سچے مومن ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چرائیں اور بلا عذر اس میں اپنی جان و مال خرچ کرنے سے پہلو تہی کریں وہ جھوٹے مومن ہیں، جنھیں آخرت پر یقین نہیں ہے اور نہ خدا کے وعدوں پر۔ ان کے دلوں کو شک اور تردد کی بیماری لگی ہوئی ہے۔

۳- عین موقعے پر جہاد میں شریک نہ ہونے اور اس سے جی چرانے والوں کے لیے ارتداد کا

لفظ استعمال کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدَی الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَھُمْ وَ اَمْلٰی لَھُمْ○ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِسْرَارَھُمْ○ فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَ اَدْبَارَھُمْ○ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَا اَسْخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ○

(محمد: ۲۵-۲۸)

''جو لوگ پیٹھ پھیر گئے اس کے بعد کہ سیدھا راستہ ان کو صاف معلوم ہو گیا، شیطان نے ان کو چکما دیا ہے اور اس کو دور دور کی سجھائی ہے۔ یہ اس سبب سے ہوا کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو خدا کے اُتارے ہوئے احکام کو (حسد سے) ناپسند کرتے ہیں، یہ کہا کہ بعض باتوں میں ہم تمھارا کہنا مان لیں گے اور اللہ ان کی خفیہ باتوں کو خوب جانتا ہے۔ پھر ان کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی جان قبض کرتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے جاتے ہوں گے اور یہ سزا اس سبب سے ہوگی کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اسی پر چلے اور اس کی رضا کے کاموں سے نفرت کرتے رہے، اس لیے اللہ نے ان کے سب کام اکارت کر دیے۔''

ان آیتوں میں منافقین کے لیے آخرت کی سزا وہی سنائی گئی ہے، جو مرتدوں اور کافروں کی ہے ـــــ جہاد سے جی چرانے اور اس میں مال خرچ نہ کرنے والوں کو بہت سی آیتوں میں منافق قرار دیا گیا ہے اور اس طرزِ عمل کو ان کی بے ایمانی کا نتیجہ کہا گیا ہے۔ اگر ان تمام آیتوں کے مضامین سے واقفیت حاصل کرنا ہو تو سورہ آل عمران، النساء، الانفال، التوبہ، الاحزاب، محمد اور الفتح کا مطالعہ کرنا چاہیے جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا۔ نفاق کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ عقیدے کا نفاق اور عمل کا نفاق، جو لوگ عقیدۃً منافق ہوں یعنی جن کے دل کافر اور صرف زبانیں مومن ہوں وہ فی الواقع دائرۂ اسلام سے خارج اور کھلے کافروں سے بھی بدتر ہیں اور ان کی سزا بھی کافروں سے سخت ہے۔ وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور جو لوگ صرف عملاً منافق ہوں وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہیں۔ اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد سے جان چرانے اور اس میں اپنا مال خرچ نہ کرنے والے دونوں قسم کے منافقین تھے اور آج بھی موجود ہیں لیکن ان دونوں کا حکم الگ الگ ہے۔

نویں دلیل

انسانوں اور جنوں کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ○ (الذاریات: ۵۶)

''اور میں نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ یہاں جو چیز بھی موجود ہے وہ سب اس کی مخلوق، مملوک اور محکوم ہے۔ اور یہ بات بھی قرآن کی آیتوں سے معلوم ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں اپنے خالق و مالک کی عبادت و تسبیح میں مشغول ہیں۔ انسان بھی اللہ کا بندہ اور اس کا غلام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے اس بااختیار (جو حیوانات و جمادات کی طرح مجبور نہیں ہے) بندے کو کس قسم کی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ کون سی عبادت ہے، جس کا یہ مکلف بنایا گیا ہے؟ آیا اس عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صرف پرستش کے لیے پیدا کیا گیا ہے یا اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر معاملے میں اس کی اطاعت بھی اس پر واجب اور لازم ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب حاصل کرنا ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر ہم نے کسی غلط جواب پر عمل کر کے اپنے دلوں کو مطمئن کر لیا تو ہم اپنے مقصد تخلیق ہی میں ناکام ہو جائیں گے۔ اس کا صحیح جواب ہم اپنی عقل لڑا کر حاصل نہیں کر سکتے بلکہ اس کا صحیح جواب ہمیں وہ کتاب ہی دے سکتی ہے، جس میں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ کی آیت نازل ہوئی ہے۔ قرآن نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ انسان کو بندگی رب کی سیدھی راہ دکھائے اور بتائے کہ وہ ''عبادت'' کیا ہے، جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانوں سے اللہ کا مطالبہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اس کی پرستش کریں بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسی کی اطاعت کریں۔ وہ شروع ہی میں ہمیں یہ بتا دیتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور کارِ خلافت و نیابت کی انجام دہی اس کی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نے تمھاری پوری زندگی کے لیے ایک دین ـــــ دینِ اسلام بھیجا ہے اور اس کی مکمل پیروی تم پر لازم ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ پانچ وقت کی نمازیں، رمضان کے روزے، مال کی زکوٰۃ اور حج تم پر فرض ہیں۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ سود حرام اور بیع حلال ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ سور حرام اور بکری حلال ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ زنا حرام اور نکاح حلال ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ناپ تول ٹھیک رکھو، ان لوگوں کے لیے تباہی ہے، جو اپنا حق ناپ کر لیں تو پورا لیں اور

دوسروں کا حق ناپ کر دیں تو کم دیں، وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ سچی گواہی دو خواہ اس کی زد تمھارے قریب ترین رشتے دار ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ تمام معاملات و مقدمات کا فیصلہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق کرو۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے خلاف حکم چلانے اور فیصلہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔ وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ چوروں کے ہاتھ کاٹ لو اور زانیوں کی پیٹھوں پر کوڑے برساؤ۔ وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرو، جان سے بھی اور مال سے بھی۔ اس سے جان چرانا اور بخل کرنا منافقوں کا کام ہے۔ پوری تاکید کے ساتھ اس طرح کے بیسیوں احکام قرآن میں موجود ہیں، جو ہمیں بتاتے ہیں کہ دین اسلام کی مکمل پیروی ہی وہ عبادت ہے، جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اس عبادت کے دائرے سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ خارج نہیں ہے اور دین اسلام کی مکمل پیروی ہی کا نام اقامت دین ہے۔

سورۂ ذاریات کی آیت ۵۶ نے انسان کی تخلیق کا جو مقصد بتایا ہے کہ اس کے فرض ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے؟

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ عبادت جس کے لیے جن وانس پیدا کیے گئے ہیں امر الٰہی کی تعظیم اور خلقِ خدا پر شفقت ہے اور ایسی تعظیم جو اللہ ذوالجلال والاکرام کے لائق ہے، صرف عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس میں شرعی احکام کی پیروی اور قولِ رسول کی اتباع ضروری ہے اور اسی لیے اللہ نے اپنے رسول بھیج کر اور عبادت کی ان دونوں قسموں کے طریقے واضح کر کے اپنے بندوں پر احسان کیا ہے۔ ان کی اس تفسیر سے بھی معلوم ہوا کہ یہاں ’’عبادت‘‘ صرف پرستش کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس عبادت کے دائرے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں داخل ہیں اور انسان عبادت کی ان دونوں قسموں کا مکلف ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیج کر عبادت کی ان دونوں قسموں کے طریقے واضح کر دیے ہیں۔ اس کے معنی بھی یہی ہوئے کہ ہمیں اس عبادت کی تفصیل جاننے کے لیے رسول کی زندگی اور اللہ کی کتاب کو سامنے رکھنا چاہیے۔

دسویں دلیل

مسلمانوں کو امت وسط اور خیر امت بنانے کی ضرورت اور اس کی غرض وغایت۔

اوپر کی نو دلیلوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دین حق کو باطل ادیان پر غالب و سربلند کرنا، جس کے لیے قرآن نے ایک جامع اصطلاح ’’اقامت دین‘‘ استعمال کی ہے۔ فرض ہے اور اس

درجے کا فرض ہے کہ اس راہ کی جدوجہد سے جی چرانا اور اس میں مال خرچ کرنے سے ہاتھ روکنا نفاق کی علامت ہے۔ یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ ہر نبی و رسول کے بعد ان کی امت اس کام میں جس کے لیے وہ مبعوث کیے گئے ہیں، ان کی قائم مقام ہوتی ہے۔ اس لیے امتِ مسلمہ اب قیامت تک اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد ﷺ کی اس کام میں جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی تھی ان کی قائم مقام ہے لیکن اب چوں کہ نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی کتاب نازل ہونے والی ہے، اس لیے قرآن نے امت مسلمہ کو مخاطب کر کے اس کو اس کا منصب بتایا ہے اور اس کو امت وسط اور خیر امت بنانے کی ضرورت اور غرض وغایت صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے تاکہ اس بات میں کوئی شبہ باقی نہ رہے کہ اب یہی امت قیامت تک اس کام کی ذمے دار ہے، جس کے لیے قرآن نازل کیا گیا ہے اور جس کا عملی نمونہ سیدنا محمد ﷺ نے پیش فرما دیا ہے۔ اس طرح قرآن کی یہ صراحت اس بات کی ایک مستقل دلیل بن گئی ہے کہ یہ امت جس کام میں اپنے رسول کی قائم مقام ہے وہ اس پر فرض ہے اور اگر وہ اسے چھوڑ بیٹھے تو اپنے مقصد وجود ہی میں ناکام ہو جائے گی۔ ہم یہاں بہت اختصار کے ساتھ اس سلسلے کی چند آیتیں پیش کریں گے۔

۱۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں فرمایا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرہ: ۱۴۳)

’’اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔‘‘

مولانا امین احسن اصلاحی ’امت وسط‘ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’وسط کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو۔ یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطہ توسط واعتدال پر ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ امت مسلمہ کو امت وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہ نمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصلی شاہراہ ہے۔‘‘ (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۳۱۹)

اُمت مسلمہ کو امت وسط یعنی عادل معتدل اور متوازن بنانے کی ضرورت اور غرض وغایت

یہ ہے:

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا
(البقرۃ:۱۴۳)

''تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کے گواہ بنو اور رسول تمھارے اوپر اللہ کے دین کا گواہ بنے۔''

''یہ امت وسط کے فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا، انھوں نے خدا کے میثاق کو توڑ دیا۔ اس کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں۔ اس کی صراط مستقیم گم کر دی۔ اس کے مقرر کیے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان کو انھوں نے چھپایا۔ ایسے حالات میں عالم انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے، جو خدا کی سیدھی راہ پر قائم ہو، جو اللہ کے رسول کے ذریعے سے اصل دین کی بنے اور پھر رہتی دنیا تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی دے۔

''رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو، سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب اس امت کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔ اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۳۲۰)

آں حضرت ﷺ نے لوگوں پر قولاً وعملاً دین حق کی جو شہادت دی تھی وہ اس کے کسی ایک جز کی نہ تھی بلکہ پورے دین کی تھی، پورے قرآن کی تھی۔ وہ شہادت آپ نے مکہ اور طائف کی گلیوں، منیٰ و عرفات کے میدانوں اور جزیرۃ العرب سے حج کے لیے آئے ہوئے گروہوں اور قبیلوں میں دی تھی اور پھر مدینہ کی مسجد نبوی، وہاں کے بازاروں اور بدر، اُحد، خیبر، حنین اور تبوک کے میدانوں میں بھی دی تھی۔ حضور ﷺ نے وہ شہادت زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ اس کے تمام شعبوں میں دی تھی۔ اس لیے آپ کی امت پر اسی وسعت و جامعیت کے ساتھ دین حق کی شہادت فرض ہے — شہادت حق کے جس عظیم منصب پر امت مسلمہ سرفراز کی گئی ہے اس کے مفہوم کو سورۂ حج کے آخر کی دو آیتوں نے پوری طرح متعین کر دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَ جَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرٰهِيمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَ فِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيرُ ۝ (حج:۷۷، ۷۸)

''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور نیکی کرو تا کہ تم فلاح پاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں اس نے تم پر کوئی سخت مشکل نہیں ڈالی۔ دین تمھارے باپ ابراہیم کا۔ اس نے تمھارا نام مسلم رکھا پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی، تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ تمھارا آقا ہے۔ بہترین آقا اور بہترین مددگار۔''

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو'' سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کے درمیان یہ ٹکڑا اس طرح آیا ہے کہ خود پکار کر کہہ رہا ہے کہ امت مسلمہ کو شہادت حق کا جو منصب سپرد کیا گیا ہے اور اللہ نے جس کام کے لیے اس امت کو منتخب کیا ہے وہ پورے دین کی اقامت کا فریضہ ہے، راہ خدا میں جہاد کا فریضہ ہے، ایسا جہاد جس کا حق ادا کرایا گیا ہو۔

''مسلم'' کا لقب اس کو اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حق کی شہادت پیش کرے۔ پہلی آیت میں رکوع وسجود، بندگی رب اور عمل خیر کا حکم دیا گیا ہے اور خاص سے عام کی طرف کلام کو اس طرح ترقی دی گئی ہے کہ پورا دین اس کے دائرے میں آ گیا اور پورے دین پر اس وقت تک عمل ممکن نہیں جب تک دین باطل کا زور نہ توڑ دیا جائے۔ اس لیے دوسری آیت کی ابتدا ہی میں جہاد کا حکم دیا گیا۔ ہمہ جہتی جہاد بہر حال ایک کٹھن چیز ہے۔ اس لیے چند باتیں ایسی فرمائی گئیں، جو بندۂ مومن کے لیے اس کڑوی چیز کو شیریں اور لذیذ بنا دیتی ہیں۔ پہلی بات ''هُوَ اجْتَبٰكُمْ'' کے ٹکڑے میں کہی گئی ہے یعنی کسی اور نے نہیں بلکہ خود تمھارے آقائے ولی نعمت نے تمام نوع انسانی میں سے تم لوگوں کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ یہ سنتے ہی اطاعت گزار اور آقا سے محبت کرنے والا غلام مسرت وانبساط کے کیف سے جھوم اٹھتا ہے اور کوئی مشکل اسے مشکل نظر نہیں آتی لیکن مہربان آقا کی طرف سے شفقت سے بھری ہوئی آواز آتی ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ'' دین

میں اس نے تم پر ایسی مشکل نہیں ڈالی جو ''حرج'' کی حد تک ہو۔'' یہ دوسری بات ہے، جس نے راہ خدا میں جہاد اور فرائض کی تعمیل کو آسان بنایا۔ تیسری بات یہ کہی گئی کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا کیش ومذہب اور دین وآئین ہے۔ ذرا دیکھو تو کہ تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام راہِ خدا میں جہاد کے کس درجے پر پہنچے اور حق کے لیے کون سی قربانی ہے، جوانھوں نے نہیں دی۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر سعادت مند بیٹوں پر باپ کی وراثت اور ان کی روش کیوں گراں گزرے۔ کچھ مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے، جس نے تمہیں ''مسلم'' کے معزز لقب سے نوازا ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ گویا اس امت کا نام ''مسلم'' رکھنے کی غرض یہی شہادت علی الناس ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ اس سے وابستہ ہو جاؤ۔ اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ پورے دین کا عنوان بھی ہے۔ تزکیہ نفس کی بہترین تدبیر بھی ہے اور راہِ حق کی مشکلات میں قوت کا خزانہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے بعد اعتصام باللہ کا حکم دیا گیا اور بات اس پر ختم کی گئی کہ اللہ ہی تمہارا آقا و مولیٰ ہے۔ یعنی جب تک تمہارا تعلق اللہ سے قوی نہ ہو، تم اس پر بھروسہ نہ کرو۔ اس سے مدد طلب نہ کرو اور وہ جب تک تمہاری مدد نہ کرے تم شہادتِ حق اور اقامت دین کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا مفسرین کرام کی تفسیریں اسی کی طرف رہ نمائی کرتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم ان کی عبارتیں یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ حج کے ہم معنی دو آیتیں سورہ آل عمران میں ہیں:

۳- وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۰۴)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (دوسروں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں) پورے کامیاب ہوں گے۔''

۴- كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران: ۱۱۰)

''اے امت محمدیہ!) تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔ تم لوگ نیک کام کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ پر

ایمان لاتے ہو۔''

یہ دونوں آیتیں مل کر ایک دوسرے کی توضیح وتکمیل کرتی ہیں اور اعلان کرتی ہیں کہ اب دنیا کی امامت امت مسلمہ کے سپرد کر دی گئی ہے۔

''امت اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے۔ اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے۔ قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (اے پیروانِ دعوت ایمان!) تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔ اس لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس امت کی جگہ قافلے کے پیچھے اور حاشیہ برداروں کی صف میں ہو اور وہ دوسری اقوام کے سہارے زندہ رہے اور قیادت ورہ نمائی، امر و نہی اور دینی وفکری آزادی کے بجائے تقلید و نقل، اطاعت و سپر اندازی پر راضی اور مطمئن ہو۔'' (مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'۔ (ص ۲۰۱، ۲۰۲)

آیت ۱۱۰ کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''خیر امت میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اب دین کی صحیح شاہ راہ پر تم ہی ہو۔ اللہ نے جو دین نازل فرمایا تھا، اہل کتاب نے اس میں کج پیچ کی راہیں نکال کر اصل دین کو گم کر دیا۔ اب خلق کی رہ نمائی کے لیے خدا نے تم کو کھڑا کیا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الآیۃ) کے الفاظ سے واضح فرمایا ہے۔ وہاں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ امت چوں کہ ٹھیک نقطہ اعتدال اور وسط شاہراہ پر ہے۔ اس وجہ سے یہ خیر امت ہے۔''

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

''نظم کے اعتبار سے یہ آیت جیسا کہ اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اس امت کے منصب امامت کا اعلان ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۷۶۲، ۷۶۳)

ان چار آیتوں سے پوری قوت اور صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس امت کے

مبعوث ہونے اور اس کے امت وسط اور خیر امت بنائے جانے کی ضرورت اور غرض و غایت ہی یہ ہے کہ یہ اسی وسعت اور جامعیت کے ساتھ دین حق کی شہادت دے، جیسی سیدنا محمد ﷺ نے دی تھی۔ اس کام میں اب یہ قیامت تک اپنے رسول کی قائم مقام ہے۔

رسولؐ اور صحابہؓ رسول کے عمل کی دلیل

جب خود قرآن مجید سے کسی کام کا فرض و واجب ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد احادیث نبوی میں ہمیں اس کی عملی توضیح اور تبیین ملتی ہے۔ سیدنا محمد ﷺ نے آغاز بعثت سے وفات تک اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ کے ساتھ اور آپ کے بعد جس طرح فریضۂ اقامت دین انجام دیا ہے اور جس طرح سر دھڑ کی بازی لگا کر دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے کی جدوجہد کی ہے وہ احادیث، سیر و سوانح اور تاریخ اسلامی کے دفاتر میں موجود ہے۔ اس لٹریچر کا مطالعہ کرنے والے اور اس سے دلچسپی رکھنے والے لاکھوں مسلمان اہل علم ہی نہیں بلکہ ہزاروں غیر مسلم اہل علم بھی اس سے واقف ہیں۔ اگر ہم دو چار احادیث[1] اور دو چار واقعات بھی یہاں نقل کریں تو یہ کتابچہ ایک کتاب کی شکل اختیار کرلے گا۔ ہم اجمال کے ساتھ یہاں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ اور ان کے ساتھیوں کا بے مثال عمل بھی رہتی دنیا تک کے لیے یہ دلیل مہیا کرتا ہے کہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے قرآن کی آیات سے یہی سمجھا تھا کہ دین حق کو باطل ادیان پر غالب کرنا اور دین اسلام کو برپا کرنا ان پر فرض اور ان کا مقصد حیات ہے۔ اس کے علاوہ سیدنا محمد ﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے وہ سیدھی راہ کھولتا ہے، جس پر چل کر ہم اقامت دین کے فرض کو ادا کرسکتے ہیں۔ اس کتابچے سے ہمارا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اقامتِ دین فرض ہے اور ہم پر یہ ذمے داری اللہ رب العالمین نے ڈالی ہے اور وہی اس کا حساب لے گا۔

خاتمۂ کلام

آخر میں اسلامی شریعت کے ایک مسلمہ اصول کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری ہے۔ وہ تسلیم شدہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے سلسلے میں بندے کی اصل ذمے داری یہ قرار دی ہے کہ وہ اسے انجام دینے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں اپنی قدرت و استطاعت کی حد تک کوتاہی

(۱) میں نے اپنی کتاب "امت مسلمہ کا نصب العین" میں متعدد احادیث بھی پیش کی ہیں۔

نہ کرے۔ اگر اس نے ایسی کوشش کرلی تو اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جائے گا۔ شریعت نے جو فرائض عائد کیے ہیں ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہوتا ہے یعنی وہ بذات خود مامور ہوتا ہے کہ اس فرض پر عمل کرکے اسے بروئے کار لائے۔ مثلاً پنج وقتہ نماز کی ادائی گی ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ اس طرح کے فرائض میں بھی سب سے پہلی چیز جو مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ انھیں ادا کرنے کا اہتمام اور اس کے لیے کوشش کرے۔ اگر اس نے سعی کرلی اور کسی ایسے مانع کی وجہ سے جس پر اسے قابو نہ تھا اس فرض کو وہ ادا نہ کرسکا تو اس کی ذمے داری پوری ہوگئی اور وہ آخرت کی باز پرس سے بچ گیا بلکہ اس فرض کو ادا کرنے کا اجر بھی اسے مل جائے گا۔ فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان کسی وقت کی نماز کے لیے پوری طرح تیار ہوکر گھر سے نکلا کہ جماعت سے ادا کرے لیکن راستے میں کسی حادثے کا شکار ہوکر دنیا سے رخصت ہوگیا اس صورت میں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ذمے داری سے سبک دوش ہوگیا بلکہ اس وقت کی نماز کا اجر بھی اسے مل گیا۔ حالاں کہ بالفعل اس نے وہ نماز نہیں پڑھی۔

کچھ فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق دوسروں سے ہوتا ہے اس قسم کے فرائض میں کسی مسلمان کی ذمے داری یہ نہیں ہوتی کہ وہ اس چیز کو وجود میں لے آئے بلکہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے وجود میں لانے کی کوشش کرے۔ اس کی واضح مثال اللہ کا یہ حکم ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا (التحریم:۶)

"اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔"

یہ آیت ہر مسلمان کو اس کا بھی مکلّف قرار دیتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اپنی اولاد کو بھی جہنم کی آگ سے بچائے۔ سوچیے اس تکلیف اور اس ذمے داری کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے ہر مسلمان کو ذمے دار قرار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اولاد کے دلوں میں ہدایت کا نور ڈال کر انھیں خدا کا فرماں بردار بنادے؟ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ ذمے داری تو اللہ نے اپنے رسولوں پر بھی نہیں ڈالی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اور ان کی بیوی دونوں ہی اڑے رہے اور عذابِ الٰہی میں غرق ہوئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بغاوت پر جمی رہی اور عذاب میں گرفتار ہوئی۔ معلوم ہوا کہ سورۂ تحریم کی آیت ۶ میں جو ذمے داری ڈالی گئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ہر مسلمان اپنی بیوی بچوں کی اصلاح کے لیے پوری کوشش کرے۔ اگر اس نے کوشش کرلی تو وہ

ذمے داری سے سبک دوش ہو گیا۔ خواہ ان کی اصلاح وجود میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ یہاں یہ مختصر اشارہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ہم پر دین حق کو غالب کرنے اور اس کو قائم کرنے کی جو ذمے داری ڈالی گئی ہے وہ یہی ہے کہ ہم اس کے لیے پوری کوشش کریں۔ اگر ہم نے پوری کوشش کر لی تو ذمے داری سے سبک دوش ہو جائیں گے اور اگر ہم نے کوشش ہی نہیں کی اور اس جدو جہد میں حصہ ہی نہیں لیا تو قیامت میں پکڑے جائیں گے اور ہم سے سخت باز پرس کی جائے گی۔

